

دروازہ

سردیوں کے دن تھے اور اسکول سے چھٹیاں بھی۔ کنبہ کے بے چین افراد نے سوچا کہ مری جا کر برف باری کا لطف اٹھایا جائے۔ امی کو ”پریشان“ ہونے کا لقب بلا وجہ نہیں ملا تھا۔ انہوں نے جانے سے صاف انکار کر دیا اور ہر ممکن کوشش کی کہ ہم بچے بھی نہ جا سکیں۔ لیکن ابو، جن کا واحد مقصد یہ تھا کہ کوئی اُنکو لے کر نہ جائے، نے ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔

تو پھر تین چار گاڑیاں بھر کے بچہ پارٹی ہمراہ ایک عدد خالہ اور خالو کے مری آن پہنچے۔ اندازاً ایک درجن لوگوں کے لئے دو کمرے کرائے پر لئے گئے جو باقی ریسٹ ہائوس سے تھوڑے الگ واقعہ تھے۔ کمروں تک ایک پگڈنڈی جاتے تھی جس کے دونوں طرف پہاڑی کی ڈھلان پر ایک سے دو فٹ برف موجود تھی۔

سورج ڈھلتے ہی درجہء حرارت تیزی سے گرنے لگا اور ہم سب لوگ ایک کمرے میں اکٹھے ہو گئے جس میں لڑکیوں کو سونا تھا۔ رات دیر تک ہلا گلا لگا رہا لیکن کسی سیانے نے ساتھ والے لڑکوں کے کمرے میں ہیٹر چلا چھوڑا تھا تاکہ کمرہ سونے کی خاطر گرم رہے۔

جب جمائی لینے اور اُونگنے والوں کی تعداد گانے اور تمبھ لگانے والوں سے قدرے بڑھ گئی تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب سویا جائے۔ ایک ایک کر کے تمام لڑکے اپنے کمرے میں جانے لگے۔ جب

میں اٹھا تو صرف اسد پیچھے بچا تھا۔ میں نے اُس سے کہا کہ جب کمرے میں آنا تو دروازے کا کنڈا یاد سے بند کر دینا کیونکہ وہ دروازہ خود سے کھل جاتا ہے۔ میں جا کر زمین پر بچھے گدوں پر پڑے کزنز کے بیچ جگہ بنا کر سو گیا۔

رات کو میں مسلسل اٹھتا رہا اور ہر دفعہ یہی محسوس ہوتا کہ ٹھنڈ میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ گدے اور لحاف کے باوجود دانت بجنے لگے اور ٹھٹھڑنا ختم نہیں ہو رہا تھا۔ اس قدر سردی میں نے کبھی زندگی میں محسوس نہیں کی تھی۔ دل ہی دل میں سوچا کہ امی ابو نے نہ آکر عقل مندی کا فیصلہ کیا۔ کاش میں بھی اسلام آباد میں اپنے گرم بستر میں ہی رہتا۔

کمرے میں سے آنے والی باقی ہلکی ہلکی بے چین آوازوں سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ سبھی سردی سے سخت پریشان ہیں۔ کانپنے اور ٹھٹھڑنے کے اس عالم میں اچانک عباس نے مجھ سے کہا ”بھائی۔ دروازہ کھلا ہے۔“

”کیا؟“ میں چونک کر بولا۔ ”کیا مطلب؟ کونسا دروازہ؟“

عباس، جو میرے ساتھ والے لحاف میں دب کر لیٹا تھا خاموش رہا۔ اس کی خاموشی اور ہل چل کی عدم موجودگی سے صاف ظاہر تھا کہ اب وہ اور کوئی بات یا حرکت نہ کرنے کا منجمد ارادہ کر چکا تھا۔

لیکن عباس کے اِس ایک جملے کہ ”بھائی۔ دروازہ کھلا ہے“ نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اِس کمرے میں صرف ایک ہی دروازہ تھا جس کا ذکر ہو سکتا تھا۔ باہر کا دروازہ، جو پگڈنڈی پر کھلتا تھا۔ وہ پگڈنڈی جس کے دونوں جانب دو دو فٹ برف پڑی ہوئی تھی۔

میں نے ایک لمبا سانس کھینچا، ہمت باندھی، اور ہچکچاتے ہوئے اپنا سر لحاف سے نکالا۔ کمرے میں ایک ہلکی سی سفید روشنی پھیلے ہوئی تھی حالانکہ کمرے کے اندر کی تمام بتیاں بند تھیں۔ اُس روشنی میں زمین اور بستر پر موجود لوگ لحاف کے بنے ہوئے پہاڑوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ اور ٹھنڈ کا یہ عالم تھا کہ میرا سانس بھاپ بن کر نکل رہا تھا۔

یہ ہرگز لحاف میں سے سر نکالنے کا موقع نہیں تھا لیکن میں عباس کے جملے کے ہاتھوں مجبور تھا۔ ”بھائی۔ دروازہ کھلا ہے۔“ میں نے مزید ہمت باندھی اور عباس کی طرف سے کروٹ بدل کر دروازہ کی طرف منہ پھیرا۔

دروازہ واقعی کھلا تھا۔ دروازے کے باہر ایک سفید ٹیوب لائٹ تھی۔ اُس کی روشنی باہر پڑی ہوئی برف سے ٹکڑا کر کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک ہی منظر میں مجھے نیم اندھیرے میں ابھرے ہوئے ٹھہرتے لحاف اور چمکتی ہوئی برف دکھائی دے رہی تھی۔

چند لمحوں کے لئے میرا دماغ اِس منظر سے دنگ ہو کر رہ گیا۔ عقل تھی محوِ تماشہ لبِ برف ابھی۔ جب ہوش میں آیا تو ذہن میں دو خیال آئے۔ پہلا تو یہ کہ میں نے اُس الو کے پٹھے اسد

کو دروازہ کی کنڈی لگانے کو خاص طور پر کہا تھا۔ اُس کی لاپرواہی کی وجہ سے ہم سب جانے کب سے ٹھہر رہے تھے۔

اور دوسرا خیال یہ کہ جب عباس نے یہ دیکھ ہی لیا تھا کہ دروازہ کھلا ہے تو مجھے جگانے کی کیا ضرورت تھی۔ خود جا کر دروازہ بند کر دیتا۔ لیکن چھوٹے بھائیوں کی خباثت سے کون ناواقف ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کمینہ چاہتا تھا کہ میں اس بے انتہا ٹھنڈ میں اُٹھ کر دروازہ بند کروں اور وہ لحاف میں چھپ کر لیٹا رہے۔

میری عقل پھر دنگ تھی لیکن اس بار عباس کی مکاری پر۔ میں نے فوراً پلٹ کر اُس سے غصے میں کہا ”عباس۔ جا کر دروازہ بند کرو۔“ آگے سے خاموشی۔ ”عباس،“ میں دھیمی آواز میں گرجا۔ خاموشی۔ ”منحوس۔ جب دروازہ کھلا دیکھ لیا تھا تو مجھے اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔“

مسلسل خاموشی۔ اُس کو ہاتھ اور لات مارنے اور لحاف میں سے جھنجھوڑنے سے بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ عباس حسبِ عادت ڈھٹائی کے اُس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں پر فرشتوں کے بھی پر جل جاتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ ڈھٹائی کے کسی بھی مقابلہ میں فتح اُس کی ہی ہوگی۔

ایک منٹ تک میں نے بھی خاموشی اختیار کر کے حُجّت تمام کی اور پھر ہار مان کر بُڑبڑاتے ہوئے لحاف سے نکلا۔ اُس وقت ٹھنڈ کا یہ عالم تھا کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ لحاف میں پلٹے ہوئے لوگوں پر سے پھلانگتا اور لڑکھڑاتا ہوا میں دروازہ تک پہنچا۔

برف کی چمک سے آنکھیں چُندھیا رہی تھیں۔ سامنے والی پہاڑی پر بسے مکانوں کی بتیاں ٹھنڈی اندھیری رات میں جگمگا رہی تھیں۔ ایک بریلی رات کی ہوا کتنی صاف ہوتی ہے اس کا اندازہ مجھے تب ہی ہوا۔ کھلے دروازے کے اندر سے داخل ہوتی ہوئی ٹھنڈی تیخ ہوانے مجھے جھنجوڑا اور میں نے جلدی سے دروازے کو بند کر دیا۔

میں پھر سے لحافوں اور گدوں پر لڑکھڑاتے ہوئے اپنی جگہ پر واپس آیا، دل کی تسلی کے لئے عباس کی پشت پر ایک عدد لات رسید کی، اور لحاف میں دبک کر سو گیا۔

صبح کو جب اٹھا تو سبھی لوگ رات کی سردی کا رونا رو رہے تھے۔ میں اس سردی کی وجہ بیان کر ہی رہا تھا کہ اسڈانگڑائی لیتے ہوئے آیا اور کہنے لگا ”اُف۔ کل رات کتنی ٹھنڈ تھی۔“ ہم سب نے مڑ کر اُس کی طرف غصہ اور حیرانی سے دیکھا اور پھر اُس کو سردی کا سبب بتایا۔

یہ جان کر کہ دروازہ اُس سے کھلا رہ گیا تھا اُس نے پہلے کھسیانی سی شکل بنائی اور پھر ہنس کر کہا کہ ”اچھا ہوا۔ اس طرح ہمیں یہ اندازہ تو ہوا کہ مجبور لوگ سردی میں کیسے گزارہ کرتے ہونگے۔“

اُس کی ہنسی کا ہمارے سردی سے تڑپے ہوئے اعصاب پر بہت برا اثر ہوا اور ہم سب نے مل کر اُس پر ایک دم یلغار کر دیا۔ کسی نے اُس کا بازو پکڑا اور کسی نے اُس کی ٹانگ۔ سب نے مل

کر اُس کو اٹھایا اور اُس بد بخت دروازے سے اُس کو گزار کر باہر پڑی ہوئی برف میں پھینک دیا۔
”سردی محسوس کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو یہاں پڑے رہو اور آئندہ دروازہ صبح سے بند کرنا۔“

عابد حسن مجتبیٰ

۵ جولائی ۲۰۱۶

اسلام آباد